قرآن اپنے متعلق کیا کہتا ہے؟

از جناب مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی

(۲)

ھُدیٰ قرآن عزیز نے "الکتاب" کے علاوہ اپنی دوسری صفت "ھُدیٰ" ہدایت۔ ہادی" بیان کی ہے وہ کہتا ہے کہ میرا یہی کمال نہیں ہے کہ میں "الکتاب" ہوں بلکہ میرا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ میں کتابِ ھدایت ہوں اور ہدایت ورہنمائی میں میری قیادت وامامت کا یہ حال ہے کہ قرآن اور ہدایت ایک ہی حقیقت کے دونام ہو کر رہ گئے ہیں اس لئے میری ہدایت کی حقیقت نمائی کی تعبیر ناقص ہوتی اگر یہ کہا جاتا کہ قرآن ایسی کتاب ہے جس میں ہدایت کا پیغام ہے کیونکہ ایک عادل حکمراں عدل وانصاف کا پیکر ہو کر "سلطانٌ عدلٌ" کہلا سکتا ہے اور اگر ایک صادق القول ہستی صدق وصفا کی تصویر ہو کر "رجلٌ صدقٌ" کہلانے کی مستحق ہو سکتی ہے تو بلاشبہ اس اظہار میں کوئی مبالغہ اور شائبۂ افراط وتفریط نہیں ہے کہ میں کتابِ ہادی ہی نہیں بلکہ "کتابِ ہُدیٰ" ہوں۔

پس جب تم دنیا ئے مذہب وملت کا تذکرہ کرتے ہوئے "ہدایت" کی تاریخ اور اس کے پسِ منظر کو سامنے لاؤ گے تو ہدایتِ کامل اور معراجِ ہدایت کی آخری منزل کا دوسرا نام قرآن کے علاوہ اور کچھ نہ پاؤ گے۔ "ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ" "قُلْ ھُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھُدًی وَّشِفَاءٌ"

ہدایت کے لغوی معنی نرمی اور لطف کے ساتھ کسی کو راہ دکھانے کے آتے ہیں۔ گویا ہدایت کے مفہوم میں "راہ نمائی" کے ساتھ رفق ونرمی شرطِ لازم ہے۔ اس لئے کہ جس طرح تنہا رفق ونرمی بذاتِ خود کوئی کمال نہیں ہے اور اپنے مواقع اور محل کی اقدار کے مطابق مذموم اور محمود کہلانے کا

استحقاق رکھتی ہے اسی طرح جو "ہدایت" درشتی اور غفلت پر مبنی ہو وہ ناقص اور غیر مفید ہے اور گمراہ کی سعادت کا باعث نہیں بن سکتی چنانچہ اسی حقیقت کے پیشِ نظر قرآن نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلقِ محمود کا اعلان کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا:۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۔ "پس خدا کی رحمت سے انھوں نے (مسلمانوں نے)
وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ ۔ تم کو نرم خو پایا اور اگر کہیں تم درشت مزاج اور
لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۔ سخت دل ہوتے تو یہ تمام کے تمام تمہارے
(آل عمران) پاس سے منتشر ہو جاتے"

پس اگر لفظِ ہدایت اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے بھی نرمی اور رفق کا طالب ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے اصطلاحی معنی میں یہ حقیقت زیادہ سے زیادہ نمایاں اور روشن ہونی چاہیے اور جو کتابِ ہدایت، رشد و ہدایت بن کر آئے از بس ضروری ہے کہ اس کا پیغام رفق و نرمی اور حسن و لطافت کا پیکر ہو اور اگر بہ تقاضائے محلِ وقوع ظاہری رنگ و روپ میں اس کو درشتی کا اظہار کرنا ہو تب بھی اس کی درشتی میں مودت و محبت کا پیغام مستور ہو۔

کون نہیں جانتا کہ اگر ایک غافل اور بد اندیش انسان لطف و نرمی سے منع کرنے کے باوجود سانپ کے منہ میں انگلی دینے پر مصر ہو تو اس کے ہاتھ کو جھٹک کر اس غلط اقدام سے زبردستی باز رکھنا درشتی اور سخت گیری کی قبیح روش نہیں کہلایا جا سکتا۔

لہٰذا قرآن کی ہدایت و رشد میں جس طرح "وعد و بشارت" کے روشن پیغام ہدایت کا جزر ہیں اسی طرح وعید و تحذیر بھی ہدایت ہی کی تکمیل کا منظر پیش کرتی ہیں اور اس طرح گویا وہ بھی رفق و یقین اور حسنِ خُلق کا دوسرا پہلو ہیں جس کے بغیر ہدایت کو معراجِ کمال کا نصیب ہونا ناممکن ہے۔

قرآن عزیز کے اعجازِ کمال نے "ہدایت" کے تمام مراتب کو کس طرح ادا کیا ہے یہ بجائے خود ایک مستقل عنوان ہے اور عقل و شعور کی کسوٹی پر پرکھنے کے لائق۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب ہم کائناتِ ذی روح پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو یہ حقیقت ہر جگہ نمایاں اور روشن نظر آتی ہے کہ رب العلمین نے عالمِ موجودات پر اپنی صفتِ ربوبیت کا کمال اس طرح ظاہر فرمایا ہے کہ اول اس کو وجود بخشا اور کتمِ عدم سے لباسِ وجود عطا فرما کر اس کو "ہستی" کے اعزاز سے نوازا اور جب وجود کی فطرت نے یہ تقاضا کیا کہ اس کی ہستی اس خاکدانِ عالم کے اسرار و حکم کے دائرہ میں تخلیقِ مادی کے لحاظ سے اپنی صحیح جگہ حاصل کرے اور تسویہ و ترتیب میں جس طرح اس کو ہونا چاہیے اسی طرح موجود ہو تو حق تعالیٰ نے اس کو اس عزت سے بھی سرفراز کیا پھر یہ بھی تقاضائے فطرت ہی تھا کہ پردۂ عدم سے جس نے وجود کا ظہور کیا اور رو جود کو اس کا حقِ تسویہ عطا فرمایا تو اس کے وجود و بقا، اور معیشت بلکہ مبدء و معاد کے لئے ایک مقرر اندازہ اور معین اقدار کا بھی فیصلہ کر دے تاکہ وہ اس ہی کے مطابق اپنی زندگی کے مراحل کو طے کرتا ہوا منزلِ مقصود تک پہنچ سکے اسی کا دوسرا نام تقدیر ہے۔

تخلیق، تسویہ اور تقدیر کے ان ہر سہ مراحل کے بعد کمالِ ربوبیت کی جانب سے وہ چوتھی منزل سامنے آجاتی ہے جس کا نام "ہدایت" ہے یعنی رب العلمین کے یدِ قدرت نے جس کو پیدا کیا اس کے مناسبِ حال اس کا بناؤ سنوار ہوا اور پھر اس کی حیات و بقار، زوال و عروج، اور زندگی سے موت تک کے سکون و رفتار کے ایک ایک پل کے لئے اقدار کا تقرر ہوا تو کیا کمالِ ربوبیت کا تقاضا یہ نہیں کہ اس کی معیشت و حیات دنیوی و دینی کے لئے ایسی راہ کھول دی جائے جس پر گامزن ہو کر وہ اپنے وجود کے صحیح مقصد کو پورا کر سکے اور مستحق آفرین و تحسین ہو اور اگر اس سے منہ موڑ کر اور فطرت کی رفتار کے خلاف ہو کر راہ بنانا چاہے تو بجز خسران و حرمان کے اس کے ہاتھ کچھ بھی نہ آسکے پس یہی وہ تقاضائے فطرت ہے جس کا اصطلاحی نام "ہدایت" ہے۔

یہی وہ روحی حقیقت ہے جس کو قرآنِ حکیم نے اس اعجاز کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی — وہ پروردگار جس نے پیدا کیا پھر اس کو درست کیا اور

وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی (اعلیٰ) وہ پروردگار جس نے ہر شے کیلئے اندازہ مقرر کیا اور پھر اس کو راہ دکھائی۔

رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (طٰہٰ) ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی صورت دی اور پھر اس پر راہ کھول دی۔

اب اگر آپ "ہدایت" کے چہرہ سے پردہ اٹھا کر اس کی صورت و شکل ہی نہیں بلکہ اس کی رعنائیوں اور نازک لطافتوں کا جائزہ لینا چاہیں تو آپ پر یہ منکشف ہوگا کہ ہدایت اپنی وسعتِ حدود کے لحاظ سے مختلف مراتب و درجات کی حامل ہے یعنی رب العلمین کی ربوبیتِ کاملہ نے اس راہ میں پہلا قدم یہ اٹھایا کہ انسان کو اس کے اندر ہی ایک آواز سے روشناس کردیا۔ یہ آواز اس کی طبیعت و فطرت کا طبعی خاصہ ہے اور دوسرے الفاظ میں ایک "الہام" ہے جس کا قدرتِ خداوندی کی جانب سے اس پر فیضان ہوتا رہتا ہے۔

یہی وہ الہام ہے جو ایک انسان کے بچہ کو پیدا ہوتے ہی ماں کی چھاتی کی جانب دودھ کے لئے راہنمائی کرتا اور مچھلی کے بچہ کو انڈے سے نکلتے ہی تیرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ اصطلاح میں اس الہام کا نام "وجدان" یا "نورِ ضمیر" ہے پھر اس وجدان سے بلند ایک اور درجہ ہے جس کو "حواس" کہا جاتا ہے۔ ہدایت کی یہ وہ منزل ہے جس کا تعلق انسان کے حواس و مشاعر سے ہے وہ آنکھ سے دیکھتا، کان سے سنتا، زبان سے چکھتا، ناک سے سونگھتا اور ہاتھ سے چھوتا ہے اور یہی وہ قویٰ ہیں جن کے ذریعہ ہم خارجی امور کا علم حاصل کرتے ہیں۔

حواسِ خمسہ کی یہ راہنمائی کچھ انسانوں کے لئے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ وجدان و حواس دونوں کا تعلق جس طرح انسان سے وابستہ ہے اسی طرح حیوان کے ساتھ پیوستہ ہے اور وہ دونوں ہی کو علیٰ قدر مراتب و درجات اپنی افادیت سے مستفید کرتے رہتے ہیں۔

لیکن ان دونوں سے جدا اور بلند و بالا تیسرا درجہ بھی ہے جو صرف حضرتِ انسان ہی کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے۔ ہدایت کے اس مرتبہ کا نام "عقل" ہے۔

عقل و خرد بھی بلاشبہ ہدایت ہی کی منزلِ عالی ہے یہ انسان کی ہر گوشہ میں راہنمائی

کرتی اور دوسرے حیوانات سے ممتاز کر کے اس کو انسانیت کا شرف بخشتی ہے اور جو کام وجدان وحواس نہیں کر سکتے اس جگہ اس کی راہنمائی کام دیتی ہے اس لئے کہ تم وجدان وحواس سے کسی شے کا تصور کر سکتے اور کس خارجی شے کی شکل وصورت اور اقدار و اوزان اور صفات خارجیہ کا اندازہ تو لگا سکتے ہو لیکن جزئیات کا تجربہ کر کے کس کلیہ کا استنباط اور کلیات پر نظر کر کے ان سے جزئیات کا استخراج دونوں کے حیطۂ قدرت سے باہر ہے اور اس جگہ عقل اور صرف عقل ہی رہبری کا کام انجام دیتی ہے۔

مگر ان ہر سہ درجات میں آپس میں بے تعلقی اور بیگانگی نہیں ہے بلکہ ادنیٰ، اوسط اور اعلیٰ ہونے میں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں یعنی وجدان قدم قدم پر حواس کے لئے دلیلِ راہ بنتا اور خیر و شر کے امتیاز سے باخبر کرتا رہتا ہے اور اسی طرح حواس و وجدان اپنے اپنے احاطۂ اقتدار میں لمحہ بہ لمحہ عقل کے لئے اعانت و معونت کی پیشکش کرتے رہتے ہیں اور ان ہی دونوں کو ذریعہ اور وسیلہ بنا کر عقل اپنے بلند مرتبہ میں انسان کی راہنمائی کا فرض انجام دیتی ہے اور نہ صرف یہ بلکہ وجدان اور حواس کی سرحدیں ختم ہو جاتی ہیں تو اس وقت عقل ہی انسان کو اس کے وجدان اور حواس کے ضعف و مرض پر مطلع کرتی اور جس جس مقام پر حواس کی درماندگیاں اور بیچارگیاں نظر آتی ہیں ان کے لئے چارہ گر ثابت ہوتی ہے۔

صفراوی مرض کا مریض جب مٹھائی کھاتا ہے تو کڑوی محسوس کرتا ہے لیکن عقل راہنمائی کرتی ہے کہ مٹھائی بہرحال شیریں ہے تلخ نہیں ہے لیکن مزاجِ انسانی کے فساد کی وجہ سے قوتِ ذائقہ مریض ہوگئی ہے۔

اسی طرح دور کی انسانی شبیہ کو آنکھ نے دیکھ کر جب یہ سمجھ لیا کہ چارپایہ نظر آرہا ہے تو عقل آگے بڑھ کر دلیلِ راہ بنتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ چوپایہ نہیں بلکہ انسان ہے اور نگاہِ دوربیں نہ ہونے کی وجہ سے مرض میں مبتلا ہے تب ہی اس کو چوپایہ سمجھ رہی ہے۔ غرض "عقل" ہدایتِ انسانی کے لئے وہ بلند درجہ ہے جو حیوانات کو عطا نہیں کیا گیا اور انسانیت کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا ہے

ہدایت کی یہی سہ گانہ منازل ہیں کہ قرآنِ عزیز نے جن کو ان آیات میں بصراحت واضح کیا ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۙ وَلِسَانًا	کیا ہم نے انسان کو دو آنکھیں نہیں دیں اور زبان
وَّشَفَتَيْنِ ۙ وَهَدَيْنٰهُ	اور دو ہونٹ عطا نہیں کئے اور اس کو نیک و بد
النَّجْدَيْنِ ۚ	دونوں راہوں کو دکھلا دیا۔
وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ	اور اللہ نے تم کو سننے کے لئے کان اور دیکھنے کے
وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ	لئے آنکھیں دیں اور (سوچنے کے لئے) دل دیئے
تَشْكُرُوْنَ ۔	(یعنی حواس اور عقل عطا فرمائے) تاکہ تم شکر گذار بنو۔"
وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا	"اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جانفشانی اٹھائی
لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ	تو ضرور ہے کہ ہم بھی ان پر اپنی راہیں کھول دیں
لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۔	اور بلاشبہ اللہ نکوکاروں کا مددگار ہے۔

ہدایت کے ان ہر سہ منازل طے کرنے کے باوجود عقل جب یہ سوچتی ہے کہ گو میرا درجہ ہر دو منازلِ ہدایت سے بلند ہے تاہم جس طرح وجدان، حواس کی رہنمائی کے لئے اور حواس، عقل کی رہبری کے لئے محتاج ہے اسی طرح انسان کی معراجِ انسانیت اور اس کا فطری ارتقا واضح کرتا ہے کہ میری راہنمائی اسی حد تک کارآمد اور مفید ہے جو حواس کے دائرہ میں ہو لیکن اگر یہ سوال پیدا ہو جائے کہ ان حواس کے پسِ پردہ کیا ہے
اور حواس سے باہر کیا کچھ ہے اور کیا کچھ نہیں ہے تو اس مقام پر میں بھی درماندہ اور عاجز ہوں اور کسی مزید راہنمائی کی محتاج۔

نیز جبکہ یہ ظاہر ہے کہ "عقل" جذبات، اوہام، خیالات اور ماحول کے احاطہ میں گھری ہوئی ہے اور اس لئے جب ہم عملی زندگی میں عقل کی اقدار کا اندازہ کرتے ہیں تو نہ ہر حالت میں مفید ثابت ہوتی ہیں اور نہ ہر صورت میں مؤثر بلکہ بسا اوقات عقل پر جذبات غالب

آجاتے۔ یا اوہام وشہوات کی کشمکش عقل کو مغلوب کر لیتی ہے تو فطرت اعلان کرتی ہے کہ جس ربوبیتِ کاملہ نے انسان کی ہدایت وراہنمائی کا ہر درجہ اور ہر منزل پر انتظام کیا ہے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ عقل کی اس درماندگی اور عاجزی کی حالت میں دستگیری نہ کرتی اور ہدایت کا وہ درجہ نہ بخشتی جو ان ہر سہ درجات سے بلند تر ہو اور ان تمام درماندگیوں کا پردہ چاک کرکے آفتابِ حقیقت کو روشن وتاباں بنا دے۔

قرآن کہتا ہے کہ یہی وہ منزل ہے جس کو مذہب کی زبان میں "وحی" کہا جاتا ہے اور نبوت ورسالت کی معرفت انسانی کائنات کے سامنے حقیقتِ سرمدی کو روشن ودرخشاں کرتا ہے اور اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ یہی وہ مرتبۂ ہدایت ہے جو انسان کو سعادتِ کبریٰ اور حیاتِ ابدی وسرمدی بخشتا اور راہنمائی میں ہر قسم کی درماندگیوں اور بیچارگیوں سے بالاتر ہو کر حقِ رفاقت ادا کرتا ہے۔

قرآنِ حکیم نے اس کے متعلق جگہ جگہ یہ اعلان کیا ہے کہ میں پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہوں "ھُدًی للمتقین" بلکہ میں تمام عالمِ انسان کی ہدایت کا کفیل ہوں "ھدًی للناس"

بہرحال "ہدایت" کا یہی وہ رتبۂ عالی ہے جس کا سلسلہ تخلیقِ انسانی کے ابتدائی دور سے مسلسل اس وقت تک جاری رہا جب تک حدِ کمال کو نہ پہنچ گیا اور "الیوم اکملت لکم دینکم و اتممتُ علیکم نعمتی" کا طغرائے امتیاز نہ پا لیا

چنانچہ حضرت آدم (علیہ السلام) سے خاتم الانبیاءؐ تک برابر یہ سلسلہ جاری رہا اور کائناتِ انسانی کے اہم فرض کو انجام دیتا رہا اس لئے کوئی دور کوئی زمانہ ایسا نہیں کہا جا سکتا کہ جس میں انسان اس حقیقت سے ناآشنا اور بیگانہ رہا ہو اور اس نے اس راہنمائی کو قبول کیا ہو یا کر دیا ہو، بہردو صورت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان نے جب بھی حیوانیت اور وحشت کے زمرہ سے ابھر کر تہذیب وشائستگی کا چولا بدلا ہو اس حالت میں وہ اس روشنی سے محروم رہا ہو۔ قرآن کہتا ہے غور کرو اور سوچو کہ انسان دورِ تاریخ میں اس ہدایت کی راہنمائی کن مقدس ہستیوں

کی معرفت آتی رہی ہے۔

وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ
عَلَىٰ قَوْمِهِ ۚ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّن
نَّشَاءُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ
عَلِيمٌ ۝ وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ
وَيَعْقُوبَ ۚ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوحًا
هَدَيْنَا مِن قَبْلُ ۖ وَمِن ذُرِّيَّتِهِ
دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَ
يُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ ۚ وَ
كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ وَ
زَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ وَإِلْيَاسَ ۖ
كُلٌّ مِّنَ الصَّالِحِينَ ۝ وَإِسْمَاعِيلَ
وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا ۚ وَكُلًّا
فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ وَمِنْ
آبَائِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ وَإِخْوَانِهِمْ ۖ
وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَىٰ
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ ذَٰلِكَ هُدَى
اللَّهِ يَهْدِي بِهِ مَن يَشَاءُ مِنْ
عِبَادِهِ ۚ (انعام)

اور یہ ہماری حجت و دلیل ہی جو ہم نے ابراہیم
کو اس کی قوم پر دی تھی۔ ہم جس کے مرتبے بلند
کرنا چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں اور یقیناً تمہارا
پروردگار حکمت والا، علم رکھنے والا ہے۔ اور ہم نے
ابراہیم کو اسحاق اور (اسحٰق کا بیٹا) یعقوب دیا۔
ہم نے ان سب کو راہ راست دکھائی اور ابراہیم
سے پہلے نوح کو دکھا چکے ہیں اور ابراہیم کی نسل
میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ،
ہارون کو بھی راہ دکھائی۔ ہم اسی طرح نیکوکاروں
کو بدلہ دیتے ہیں۔ اور زکریا اور یحییٰ، عیسیٰ، الیاس کو
کہ یہ سب صالح انسانوں میں سے تھے اور نیز اسمٰعیل
الیسع، یونس اور لوط کو کہ ان سب کو ہم نے دنیا
والوں پر برتری دی تھی۔ اور ان کے آباء واجداد
اور ان کی نسل اور ان کے بھائی بندوں میں سے
بھی کتنوں ہی کو ہم نے اسی راہ پر چلایا۔ ان سب
کو ہم نے برگزیدہ کیا تھا اور سیدھی راہ ان پر
کھول دی تھی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے اپنے بندوں
میں سے جسے چاہے اس کی روشنی دکھا دے۔

الہدیٰ | اس حقیقت کی نقاب کشائی کے بعد قرآن کہتا ہے کہ بات صرف یہیں پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتی کہ یہیں "ھدیٰ" اور عقلِ انسانی کے لئے سعادتِ ابدی اور فلاحِ سرمدی کے لئے ہادی

اور رہنما ہوں بلکہ میں وہ جانی پہچانی ہدایت ہوں جس کا تجربہ انسانی تاریخ نے اپنے ہر دور میں کیا اور جس کے فیضان سے زمانہ کا ہر ایک حصہ بہرہ ور رہا ہے اس لئے میں "الہدیٰ" ہوں۔ یعنی وہی ہدایت جس کا آغاز حضرت آدم و حضرت نوح (علیہم السلام) سے ہوا اور وہی ہدایت جس نے تاریخِ انسانی سے قبل اور دورِ تاریخی میں حضرت ابراہیم و حضرت موسیٰ (علیہم السلام) کے ذریعہ کائناتِ انسانی کو روحِ حیات بخشی۔ آج اپنے عروجِ کمال اور شکلِ اعلیٰ پر پہنچ کر "قرآن" کی شکل میں نمودار ہوئی ہے۔

پس اگر وہ اسی آغاز کا انجام ہے اور سابق ہدایت کی نہایت و غایت اور حدِ کمال ہے تو اس کے دعویٰ "ہُدیٰ" سے گریز کیوں اور اس کے اعلانِ ہدایت سے اجنبیت کی کیا وجہ؟

اگر انسان اپنی شکل و صورت اور جسم و مادہ کی تاریخی شہادت کو نہیں بھولا تو اس روحانی سعادت کے آغاز اور اس کے نشو و ارتقار کو کیسے فراموش کر دے سکتا ہے۔ اور اگر فراموش نہیں کر سکتا تو بلا شبہ میرا یہ اعلانِ حق و صداقت کی صدا ہے کہ میں ثقلین اور کائناتِ انسانی کے نظامِ ہدایت کی آخری کڑی "الہدیٰ" ہوں۔

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى۔ (انعام)	اے پیغمبر کہدیجئے کہ بے شبہ اللہ کی ہدایت ہی "الہدیٰ" ہے۔
وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى (البقرہ)	اور یہودی اور نصرانی تم سے خوش ہونے والے نہیں جب تک تم ان کی ملت کی پیروی نہ کرو (اے پیغمبر!) کہدیجئے کہ بے شبہ اللہ کی ہدایت ہی "الہدیٰ" ہے۔

وہ کہتا ہے کہ حقیقی ہدایت کی پہچان کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی اساس و بنیاد میں ایک انوکھی اور اجنبی چیز نہ ہو بلکہ جو شخص بھی اس حقیقت کے تاریخی پہلو پر نظر ڈال کر غور کرے تو وہ فوراً پہچان لے کہ یہ صدا وہی صدائے باز گشت ہے جو گذشتہ انسانوں نے

اپنے اپنے دور میں برابر مبنی ہے۔ پس اس معیار پر میں ایسی "ہدایت" ہوں جو عالمگیر ہے اور بلا تفریق تمام کائناتِ انسان کے لئے ہے اور اس کے کمال کی شہادت کے لئے خود انسان کی اپنی زندگی شاہد عدل ہے کہ جس طرح وجدان، حواس اور عقل کی ہدایت میں ربوبیتِ کاملہ نے بغیر کسی تنگ دامنی کے تمام کائناتِ انسانی کو یکساں فیضیاب کیا ہے۔ اسی طرح "الہدیٰ" کی ہدایت بھی بلا امتیاز نسل و قوم اور بلا تفریق اسود و احمر سب کو اپنے فیضِ کامل سے سرفراز کرنے والی ہے۔

قرآنِ حکیم نے جس طرح ہدایت کے ان تمام درجات کو واضح کرتے ہوئے ہر گوشۂ ہدایت کو بے نقاب دکھلایا ہے۔ اور دعویٰ کیا ہے کہ اس کا پیغام ان تمام ہدایات سے وابستہ ہو کر ہدایت کے مقصدِ عظمیٰ تک پہنچا دیتا ہے اسی طرح اس نے ہدایت کی افادیت سے بھی بحث کی ہے۔

اور اس نقطۂ نظر سے اس نے ہدایت کے دو معنی بیان کئے ہیں اور ان ہی دونوں کے ساتھ اس کی دعوت و ارشاد کا منصب وابستہ ہے۔ ایک معنی "راہ نمودن" اور دوسرے معنی "توفیق دادن"۔

ہدایت کے ان دونوں معانی کے باہم فرق کو آپ ایک مثال میں اس طرح سمجھئے کہ ایک گم کردہ راہ آپ سے التجا کرتا ہے کہ مجھ کو جامع مسجد تک جانا ضروری ہے کیا میں آپ سے توقع کروں کہ آپ منزلِ مقصود کے لئے میری مدد فرمائیں گے؟ اس التجا کے قبول میں آپ کے لئے دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ گم کردہ راہ کو جامع مسجد تک پہنچنے والی سڑک کی پُر پیچ راہوں کے فرق کو بتلا کر اس کی صحیح راہ نمائی کر دیں کہ اگر وہ اس کا امتثال کرے تو بلا تکلف منزلِ مقصود تک پہنچ جائے اور دوسری صورت یہ کہ آپ اس کے ساتھ جا کر اس کو جامع مسجد پہ لے جا کر کھڑا کر دیں بلکہ مسجد کے اندر تک پہنچا آئیں۔ پہلی صورت کو "راہ نمودن" "راہ دکھلانا" کہتے ہیں اور دوسری صورت کو "توفیق دادن" "منزلِ مقصود تک پہنچا دینا" کہا جاتا ہے اور اسی کو عربی زبان میں "ارائۃ الطریق" اور "ایصال الی المطلوب" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

قرآنِ عزیز کہتا ہے کہ یہ منصب تو صرف خدائے برتر ہی کے لئے مخصوص ہے کہ وہ جس کو چاہے قبولِ حق کی توفیق بخشدے یہ بشری اور انسانی طاقت سے باہر ہے خواہ وہ عام مصلح ہو یا پیغمبر و رسول حتیٰ کہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے یہ صاف صاف فرمادیا۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (قصص) — اے پیغمبر! بلاشبہ تم جس کو راہ پر لانا چاہو، نہیں لاسکتے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سیدھی راہ پر لے آئے۔

اس آیت کا بے غل و غش یہی مطلب ہے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ چاہیں کہ کسی کو قبولِ حق کی توفیق بخشدیں تو یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے یہ تو خدا ہی کے لئے زیبا ہے اور "توفیق" اسی کی ذاتِ حق کے ساتھ مخصوص ہے اور ہدایت کا یہی وہ درجہ ہے جس کو بندہ کی زبان سے دعائیہ پیرایہ میں یوں کہا گیا ہے "اھدنا الصراط المستقیم" یعنی ہم کو توفیق نیک عطا فرما کہ ہم راہِ مستقیم تک پہنچ جائیں کہ گمرہی کا پھر گذر ہی نہ ہوسکے۔

البتہ "راہ نمودن" کا انتساب جس طرح خدائے برتر کی جانب ہوتا ہے اُسی طرح کتابِ رشد و ہدایت اور اس کے حاملینِ انبیاء و رسل کی جانب بھی بے تکلف ہوتا ہے بلکہ کتاب اللہ اور رسول اللہ کا فرض ہی یہ قرار پایا ہے کہ وہ گم کردگانِ راہ کی راہ نمائی کریں اور راہِ حق سے بھٹکے ہوؤں کے لئے مشعلِ راہ بنیں چنانچہ کتابِ حکیم نے ان ہر سہ گونہ انتسابات کو متعدد مقامات میں اس طرح ذکر کیا ہے

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (حم سجدہ) — لیکن ثمود، تو ہم نے ان کو راہ دکھلائی پس انھوں نے گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دی۔

اس آیت میں "راہ نمودن" کا انتساب اللہ تعالیٰ کی جانب ہے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ — بلاشبہ یہ قرآن وہ دکھلاتا ہے جو سب سے

لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (بنی اسرائیل) سیدھی ہے۔

یہاں قرآن کو " راہ نمودن " کا حامل قرار دیا ہے۔

وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (شوریٰ) اے پیغمبر! بلاشبہ تم راہ دکھلاتے ہو سیدھی۔

اس مقام پر ذاتِ اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فرض " راہ نمودن " کو بیان کیا ہے۔

یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ اے باپ! میرے پاس بلاشبہ وہ علم (اللہ کی جانب سے)

الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْۤ آیا ہے جو تیرے پاس نہیں ہے پس میری پیروی کر

اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا (مریم) کہ میں تجھکو سیدھی راہ دکھلادوں۔

اس جگہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی جانب اسی راہنمائی کا انتساب ہے۔

یٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ اے قوم! میری راہ چل، پہنچادوں میں تجھ کو

سَبِیْلَ الرَّشَادِ (مومن) نیکی کی راہ پر۔

اور اس موقع پر ایک مردِ مومن کے اس فریضہ کا ذکر ہے جو قوم کے لئے ہادی و راہنما کی حیثیت سے انجام دے رہا تھا۔

غرض صراطِ مستقیم، صراطِ سوی، سبیلِ رشاد کی جانب رہنمائی ایسا اہم فرض ہے جس کی عظمت وجلالت کا ذکر مختلف اسالیب بیان کے ساتھ کتبِ سماوی میں موجود ہے اور یہی وہ ہدایت ہے جس کو قرآن نے بہ درجۂ اکمل واتم انجام دیا ہے۔ مگر جب یہ ہدایت اپنا اثر دکھلاتی ہے اور گم کردہ راہ گمرہی سے نفور ہو کر ہدایت سے فائز المرام ہوتا ہے تو انسان اپنی کمزوریوں اور خامیوں کے پیشِ نظر مطمئن نہیں ہوتا کہ جام عمر کے لبریز ہونے تک وہ ایسی نیک راہ پر قائم بھی رہ سکے گا یا نہیں اس لئے وہ خالقِ کائنات کی بارگاہ میں دستِ سوال پھیلا کر عرض رسا ہوتا اور استقامت وثبات ہدایت کے لئے دعاگو نظر آتا ہے اور کبھی کہتا ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۔ ہم کو سیدھی راہ پر قائم رکھ

اور کبھی یوں گویا ہوتا ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ — اے ہمارے پروردگار ہمارے دلوں کو کج نہ کر اس کے
اِذْ هَدَيْتَنَا — بعد کہ تونے ہم کو راہِ ہدایت دکھلا دی ہے۔

اور کبھی شکر و حمد کے پیرایہ میں اس کا ذکر کرتا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ هَدَانَا — اس اللہ کے لئے تمام تعریفیں جس نے ہم کو اس
لِهٰذَا۔ — نیک راہ کی توفیق بخشی۔

اور ہدایت کے اسی پہلو کو کبھی اللہ تعالیٰ جزاءِ ہدایت اور ثواب ہدایت کے معنی میں ظاہر فرماتا اور عبدِ مہتدی کو بشارت دیتا ہے۔

يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ — ان کا پروردگار ان کے ایمان کے سبب ان کو
بِاِيْمَانِهِمْ۔ — ثوابِ ہدایت عطا فرماتا ہے۔

ہدایت کے ان تمام شعبہ ہائے گوناگوں اور درجات و مراتب کو قرآن حکیم نے اعجازِ بیان کے ساتھ اس طرح واضح اور نمایاں کر دیا ہے کہ اس باب میں ماضی اور مستقبل کے تمام علمی پہلو روشنی میں آجاتے ہیں اور بغیر کسی مبالغہ کے کہا جا سکتا ہے کہ رشد و ہدایت کی عظمت کے جس قدر بھی گوشے عقلی تصورات کے دائرہ میں آسکتے تھے ان سب ہی کو قرآن نے ابھری ہوئی حقیقت کی طرح پیش کر دیا ہے۔ اور معیشت و معاشرت، اخلاق و سیاست، تمدن و حضارت دنیا و آخرت غرض معاد و معاش کا کوئی گوشہ اور کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کے لئے قرآن میں ہدایت کے اصول و قوانین اور نوامیس موجود نہ ہوں اس لئے بلاشبہ وہ صرف "ہادی" اور "ہدیٰ" ہی نہیں ہے بلکہ سرچشمۂ ہدایت اور "الہدیٰ" ہے اور یہی اس کا طغرائے امتیاز ہے۔

اس تفصیل کے بعد ایک مرتبہ آپ پھر قرآن کے اس اعلان کا جائزہ لیجئے کہ وہ کائناتِ انسانی کے معاش و معاد دونوں کی رشد و ہدایت کے لئے امامِ ہدیٰ اور سرچشمۂ ہدایت ہے کیونکہ وہ ہدایت کے ان تمام اطراف و جوانب اور درجات و منازل کے لئے مکمل روشنی بہم پہنچاتا ہے جو بنی آدم کی پیدائش سے لے کر موت اور مابعد الموت تک کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیتے ہیں

وہ کہتا ہے کہ وجدان اور نورِ ضمیر جو ہدایت کی پہلی منزل ہے جو انسانی وجود کے ابتدائی دور میں مادی تربیت کی کفیل ہے اور شعور و بلوغ کے ساتھ ساتھ اس کی مادیت و روحانیت دونوں کے لئے نور روشن ہے اس لئے وہ اپنے دلائل و براہین میں اس ہدایت کے ذریعہ اپیل کرتا اور مختلف اسالیبِ بیان کے ساتھ اپنے پیغامِ حق کو اس کے ساتھ وابستہ کرتا ہے تاکہ دینِ فطرت کے پیغام کی اساس، فطری برہان و حجت ہی پر قائم رہے اور حواس و عقل اس راہ کے وہ تمام منازل و مدارج ہیں کہ کائناتِ انسانی کے تمام امتیازات ——— مادی ہوں یا روحانی ——— ان ہی کے فیض کے نتائج و ثمرات ہیں اور اسی بنیاد پر اُس کے دلائل و براہین کا رخ منطقی اصطلاحی استدلالات سے بے نیاز ہو کر فطرت کے سادہ اور روشن دلائل کی جانب ہے اور وہ خدا کی ہستی، پیغمبرانِ خدا اور کتبِ سماوی کی صداقت، موت اور مابعد الموت کے غیبی مسائل پر جس قدر دلائل پیش کرتا ہے اُن کا نوامیسِ فطرت اور مناظرِ قدرت کے ساتھ گہرا تعلق نظر آتا ہے کیونکہ اس قسم کے تمام مسائل کے استدلالات کے بعد اس کا بار بار یہ کہنا "افلا تبصرون" "افلا تشعرون" "افلا تعقلون" اس کے لئے روشن شہادت ہے۔

وجدان، حواس، اور عقل کے بعد وہ آگے ایک اور قدم بڑھاتا ہے اور ہدایت کی آخری منزل کی جانب راہنمائی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہدایت کے یہ ہر سہ منازل باوجود اپنی وسعتِ حدود کے مادیات و محسوسات سے آگے کچھ کہنے اور حکم کرنے سے درماندہ و عاجز ہیں اور نہیں بتلا سکتے کہ اس پردہ کے پیچھے کیا ہے لیکن وجودِ انسانی کی فطرت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ میری ہستی کسی غرض و غایت کے بغیر معطل و بیکار نہیں بنائی گئی اور یہ زندگی بلاشبہ پیدا کرنے والے کے سامنے "مسؤل عنہ" ہونی چاہیئے۔

لہذا عقل سے بالاتر مگر اس کی ہدایت کے لئے معاون و مددگار ہدایت کا نام ہدایتِ "وحی و الہام" ہے اور یہی اسی ہدایت کی ترقی یافتہ آخری کڑی ہے اور کائناتِ انسانی بلکہ ثقلین کی سعادتِ ابدی و سرمدی کے لئے سرمایۂ حیات بن کر حیاتِ جاودانی کی کفیل ہے

وہ کہتا ہے میرے اس دعوی کی تصدیق کے لئے ادیان ملل کی تاریخ سے دریافت کرو کہ جب کائناتِ ہست و بود میں تیرگی و تاریکی کا یہ عالم تھا کہ خدائے واحد کی ہستی کا اعتقاد مشرکانہ عقائد و رسوم میں گم ہوکر بے کیف ہوچکا تھا۔ خدا پرستی کی جگہ مظاہر پرستی نے لے لی تھی اور خدا اور اس کے بندوں کا حقیقی علاقہ گم ہوگیا تھا اور چاردانگ عالم کے سچے ہادیوں کی ہدایت پردۂ ضلالت میں مستور ہوچکی تھی اُس وقت رعد و برق کی طرح کڑک اور چمک کر کس نے گم کردگانِ راہ کو راہِ ہدایت دکھلائی، کس نے توحیدِ خالص کا سبق دہرایا، اور کس نے کائنات کا حقیقی رشتہ خالقِ کائنات کے ساتھ جوڑا، لوتھر کو آزادیِ فکر کی راہ کس نے سمجھائی۔ اور شنکرا چاریہ کو توحیدِ الٰہی کا سبق کس نے یاد دلایا اور شرک کی محفل سرود میں توحید کا نغمہ کس نے سنایا؟

اولاً تاریخ عالمِ سیاسی سے شہادت حاصل کرو کہ جب تمام کائناتِ بوقلموں میں کمزور کو قوی کہائے جارہا تھا، مظلوم پر ظالم غالب و متسلط تھا اور عرب و عجم اور ایشیا و یورپ، افریقہ و امریکہ یا جہالت کی تاریکی میں تمدن سے ناآشنا زندگی بسر کر رہے تھے اور یا تمدن کے نام پر جور و ظلم کی حکمرانی تھی اس وقت کس آواز نے روم و ایران کو لرزہ براندام کرکے غلاموں اور بیچاروں کے لئے آقائی اور چارۂ کار مہیا کیا اور مساواتِ انسانی کا سبق سنا کر کس نے مظلوم اور بیکس کو ظلم و جبر سے نجات دلائی؟۔

اور فلسفۂ معاشیات کے مبصر سے استفسار کرو کہ جب روم و ایران بلکہ ایشیا و یورپ میں ہر طرف تمدن کے نام سے عام بدحالی اور فاقہ مستی پھیلی ہوئی تھی اور دولت و ثروت سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ کی وراثت بن گئی تھی۔ جب کروروں انسان ٹیکس کے نیچے دبے ہوکر نانِ جویں سے محتاج تھے اور دولتِ شاہی حکام اور درباری مصاحب کے درمیان چکر کھا رہی تھی اس وقت زکوٰۃ، حرمتِ سود، وراثت جیسے تقسیم دولت کے قوانین نافذ کرکے کس نے یہ اعلان کیا کہ یہ سب اس لئے ہے "کیلا یکون دُولۃً بین الاغنیاء منکم" تاکہ دولت مالداروں کے درمیان ہی چکر نہ کھاتی رہے"؟

اور پوچھو سماج اور معاشرت کی قدیم تاریخ سے کہ جب انسانی دنیا کاسٹ سسٹم کی مضبوط زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی اور جب انسان دو حصوں اچھوت اور غیر اچھوت میں تقسیم تھا۔ جب عورت انسانی حقوق سے محروم تھی، جب غلام انسانی حقوق سے بیکار و بے بس تھا۔ جب بیوہ عورت ننگِ خاندان تھی، جب زندہ لڑکیاں درگور کی جاتی تھیں، جب عورت مذہب کے نام پر کنواری اور دیوداسی بن کر مرد کی نفسانی خواہشات کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھائی جاتی تھی اور جب مردہ شوہر کے ساتھ زندہ ستی ہو کر حیاتِ مستعار سے محروم کر دی جاتی تھی اس وقت ان رسومِ جاہلیت اور عقائد باطلہ کے خلاف کس نے عالمِ رنگ و بو میں علمِ بغاوت بلند کیا اور کس نے ان کو فنا کے گھاٹ اتار کر سماج اور معاشرہ میں یکسر انقلاب کر دیا۔ غرض حیاتِ مستعار اور حیاتِ جاوداں دونوں گوشوں کے تاریک پردوں کو چاک کر کے کس نے مشعلِ ہدایت دکھلائی اور اقوامِ عالم کی اقدار کو کس نے بدل ڈالا تو ان سب باتوں کا حقیقی جواب، تاریخی اور سماجی جواب ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے یعنی وہ یہ کہ یہی "الہدیٰ" ہے جس کا دوسرا نام "الکتاب" ہے اور یہی ہے جس کے لئے صاف صاف کہا گیا ہے "قُلْ اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَ الْھُدٰی"۔

گذشتہ بحث میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہاں جو کچھ ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے اور آئندہ جو کچھ ہوگا وہ ذاتِ واحد کے ایک ہی قانونِ وحدت کے زیر اثر ہے اور فطرۃ اللہ کی کارفرمائیاں جس طرح مادیات میں کارفرما ہیں ٹھیک اسی طرح روحانیات پر بھی اثر انداز ہیں تو اب حقیقتِ بالا، کو دوسرے انداز میں یوں سمجھئے کہ اقوام و امم کے کوائف و حالات اس بات کی زبردست شہادت ہیں کہ حق تعالیٰ انسان کی حیاتِ اجتماعی کے لئے بھی وہی تطورات و درجاتِ ارتقا ودیعت کئے ہیں جو ایک فردِ انسانی کی بقار و ترقی کے لئے مقرر ہیں اور عنایاتِ الٰہیہ دونوں پر یکساں طریق سے فیضان کرتی رہتی ہے۔

کون نہیں جانتا کہ ایک بچہ اپنی پیدائش کے وقت حد درجہ کمزور اور بے بس مخلوق کی طرح ہوتا ہے۔ نہ وہ علم و عقل سے کام لے سکتا ہے اور نہ فکر و کاوش سے، اس کی تو یہ حالت ہوتی ہے۔

وَاللّٰہُ اَخْرَجَکُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (النحل)

اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے اس حال میں پیدا کیا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور اس نے تمہارے سننے کے لئے کان دیئے اور دیکھنے کے لئے آنکھیں دیں اور سمجھنے کے لئے دل دیئے تاکہ تم شکر گذار بنو۔

اس کے بعد والدین یا دوسرے کفیل اس کی مدد کرتے اور تربیت و تادیب کے ذریعہ اس کے شعور و وجدان کو ترقی دیتے ہیں اور غلط راہوں سے محفوظ کر کے صحیح راہ پر لگاتے ہیں پھر جب قویٰ بدنی و عملی میں قوت و استعداد نشو و نما پاتی ہے اور اب سن رشد و بلوغ آجاتا ہے تو اس وقت بیشتر عقل کی راہنمائی کام دیتی ہے اور بہ تفاوتِ درجات عقل ہی اس کی رہنمائی کرتی ہے اور جس طرح قوتِ جسم و بدن کی نشو و نما کی حدود سن رشد پر پہنچ کر کامل ہو جاتی ہیں اسی طرح اس کے شخصی قوائے مدرکہ و علمیہ "عقل" کی کارفرمائی پر پہنچ کر نشو و نما کے حدِ کمال تک منتہی ہوتے ہیں۔

پس جس طرح شخصی قویٰ بدنی و قویٰ مدرکہ آہستہ آہستہ اور بہ تدریج نشو و نما پا کر حدِ کمال کو پہنچ جاتے ہیں اسی طرح انسان کی جماعتی زندگی بھی بچپن، سنِ شعور اور سنِ کمال کے درجات تک آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہے چنانچہ انسان کی حیاتِ اجتماعی کا دورِ صبا در بچپن کا زمانہ ایسی حالت میں گذرتا ہے کہ وہ اجتماعی ضروریات اور اس کے شئون و تطورات سے ناواقف ہوتا ہے وہ نہیں جانتا کہ جماعت کے کیا مقاصد عالیہ ہیں اور کیا ان کی غرض و غایت ہوتی ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکتا کہ نظامِ اجتماعی کس طرح منظم ہوتا اور کائناتِ انسانی کو ایک سلک میں منسلک کرتا ہے بلکہ سادگی اور سادہ لوحی سے ایک دوسرے کے ساتھ روابط و حاجات کو محسوس اور مشاہدہ کرتے ہوئے اسی دائرہ میں محدود رہتا ہے اس دور کے بعد حوادثِ عالم، تطوراتِ زمانہ اور تکوناتِ عالم اس کو والدین کی طرح اپنی آغوش میں تربیت دینے اور حیاتِ اجتماعی میں نشو و نما پانے کی

استعداد کو قوی سے قوی تر بناتے رہتے ہیں حتی کہ وہ اس نشو و ارتقا کے ذریعہ اس زندگی کے حدِ کمال تک پہنچ جاتا ہے اور اجتماعی حیات کے اعلیٰ مقاصد، احسن مطالب اور اکمل معانی کا حامل بن جاتا ہے اور ان ہی درجات و تطورات اجتماعی کو تاریخی اصطلاح میں دورِ حجری، دورِ حدیدی دورِ بخاری اور دورِ کہربائی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

پس جس طرح عالمِ مادیات کا یہ نظام اجتماعی بہ تدریج ترقی کرتا ہوا حدِ کمال تک پہنچتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح عالمِ روحانیات میں بھی انسان کا یہی حال ہے کہ جب عقل کے ماوراء اس کی عقل نظر کرتی ہے تو ایک عرصہ تک وہ اسی دائرہ میں محدود رہتا ہے اور اس کی عقل و خرد کا ماحول جو خیالات، جذبات، شہوات سے گھرا ہوا ہے، الٰہیات و روحانیات کے فہم میں ایک بچہ کی مانند نظر آتا ہے۔ پس یہ ماحول اس کو ایک عرصہ تک تو اس میدان سے بے شعور و بیگانہ رکھتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے کبھی انسان مظاہر پرستی میں عالمِ سفلی کا پرستار نظر آتا ہے اور کبھی عالمِ علوی کے سامنے سربسجود دکھائی دیتا ہے۔ تب عنایتِ خداوندی اور رحمتِ باری سہارا دیتی ہے اور ماوراء مادیات و محسوسات کے درک و استدراک کے لئے عقل سے زیادہ لطیف اور خیالات و اوہام سے بالاتر ہدایت سے روشناس کراتی اور اس کے ذہنی و روحانی ارتقا کے حدِ کمال تک پہنچاتی ہے اسی کا نام مذہب کی اصطلاح میں "وحی و الہام" ہے وہ آکر انسان کو اذعانِ کامل اور یقینِ محکم کے ساتھ مظاہر پرستی کی حقیقت کو عریاں کرتی اور حقیقت و مظہر کے درمیان امتیاز پیدا کر کے پرستارِ حقیقت بناتی ہے۔

چنانچہ انبیا و رسل کی تاریخ ہدایت اسی حقیقت نمائی کا ایک غیر فانی سلسلہ ہے جو کائناتِ انسانی کے روحانی نشو و نما کا کفیل اور ضامن ہے اور قرآن عزیز اسی سلسلہ کی غیر متبدل و غیر متحرف دستاویز ہدایت ہے جو رہتی دنیا تک اپنے بے پایاں کمالات اور غیر محدود افادات کے ذریعہ "الہدیٰ" بن کر راہنمائی کرتا رہے گا تا آنکہ عالمِ انسانی کی حیاتِ اجتماعی میں وہ روشن دور بھی آ جائے جبکہ کوئی سوسائٹی، سماج کا کوئی گوشہ اور قانون کا کوئی نقطہ اس مرکز و محور

سے باہر نہ رہ سکے

الحاصل ہدایت کے تمام مراتب و درجات اور معانی و مطالب کے پیش نظر بلا شبہ قرآن ہدایتِ کامل اور ہُدیٰ ہے اور اسی لئے آیاتِ قرآنی میں جگہ جگہ اس کے اِس وصفِ عالی کو دُہرایا اور یاد دلایا گیا ہے تاکہ اس کا یہ وصفِ کامل ایک لمحہ کے لئے بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہ ہو سکے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ، آل عمران، انعام، نسار، مائدہ، اعراف، طٰہٰ، لقمان، توبہ نمل، نحل، اسرائیل، قصص، محمد، نجم، جن، کہف میں اس حقیقت کو اعجازِ بیان کے مختلف طریقوں سے واضح کیا گیا ہے۔

نور | قرآن "الکتاب" اور "الهدیٰ" ہے۔ اس تفصیلی بحث کے بعد قرآنِ حمید یہ بھی دعوی کرتا ہے کہ وہ "نور" ہے۔ یعنی واضح اور روشن ہے جس کے معانی میں گنجلک نہ مطالب میں اغلاق، جس کے اعجاز میں خفار نہ وضاحتِ احکام میں پیچیدگی، وہ جس طرح نظم و انسجام میں بے غل و غش نورٌ علیٰ نور ہے۔ اسی طرح ادا مطالب و معانی میں بھی روشن و درخشاں ہے، اس کے دعاوی کی سادگی، دلائل کی شگفتگی، اوامر و نواہی کی وضاحت، وعدو وعید کی فخامت غرض ہر گوشۂ بیان نور ہی نور ہے جو تاریکی سے کوسوں دور اور ظلمت کے خلاف مظفر و منصور ہے اس کی تعلیم کی درخشانی و تابانی خود اس کے لفظ لفظ سے عیاں ہے اور اس کا ہر جملہ تابشِ حقیقت کا ترجمان ہے کیوں ہے اور کس طرح ہے؟ اس کو اس طرح غور فرمائیے۔

اگر تم کو گذشتہ سطور فراموش نہیں ہوئیں اور کائنات مادی و روحانی میں وحدت کی کارفرمائی اور ناموسِ فطرت کی ہم آہنگی کا تصور پیشِ نظر ہے تو غور کرو کہ حق تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے انسان کے حواسِ خمسہ میں سے آنکھ کو قوتِ بصارت عطا فرمائی ہے اور وہ بصارت کی حس کا احساس کر کے اپنی خدمت کو انجام دیتی رہتی ہے۔ اس فلسفیانہ موشگافیوں سے جدا رہ کر کہ بصارت کیا ہے؟ کیا باہر سے شے کا عکس پڑ کر آنکھ بینائی کا غرض انجام دیتی ہے یا آنکھ کی روشنی مخروطی شکل بن کر شے کو روشن کر دیتی ہے اور اسی کا نام رویت و بصارت ہو جاتا ہے؟

یہ بات بہر حال مسلمات میں سے ہے کہ یدِ قدرت نے انسان کے اندر بصارت کی قوت ودیعت فرمائی ہے لیکن ہم شب و روز یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ اگر بقول حافظ شیراز۔ شبِ تاریک بیم موج گردابے چنیں حائل ـــ کا منظر سامنے ہو اور تاریکی تو بر تو چہار سمت چھائی ہو تو اس وقت ہر شخص یہ کہتا نظر آتا ہے کہ اس قدر اندھیرا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ نظر نہیں آتا۔ لیکن جب کوئی سائل یہ دریافت کرنے بیٹھے کہ انسان کے اندر جبکہ بصارت کی قوت ودیعت ہے اور وہ تلف بھی نہیں ہوئی تو ایسا کیوں ہوتا ہے؟ تب آپ یہ جواب دیتے ہیں کہ بلاشبہ نہ آنکھ کا قصور ہے اور نہ آنکھ کی بینائی کا بلکہ قانونِ قدرت اور ناموسِ فطرت کا یہ فیصلہ ہے کہ انسان کے اندر ودیعت شدہ قوتِ بصارت ماحول کے اثراتِ ظلمت سے اس درجہ متاثر ہو چکی ہے کہ صحتِ بصارت کے باوجود اس وقت تک کام کرنے اور اپنی افادیت کا مظاہرہ کرنے سے معذور ہے جب تک باہر سے کوئی روشنی اعانت و مدد نہ کرے اب خواہ وہ روشنی دیئے اور چراغ کی ہو یا شمع کافوری کی، ہری کین کی ہو یا گیس کی اور یا بجلی کے قمقمے کی یا ستاروں اور ماہتاب و آفتاب کی ہو اُن میں سے جیسی قوت و وسعت کی روشنی ہوگی انسان کے اندر کی قوتِ بصارت اسی وسعت کے ساتھ اپنی خدمت انجام دے گی۔

(باقی آئندہ)